(۲۷)

(فرمودہ ۵- دسمبر ۱۹۳۷ء بمقام عید گاہ- قادیان)

دنیا میں یہ ضرورت ساری قوموں میں محسوس کی گئی ہے اور سارے ملکوں میں محسوس کی گئی ہے کہ زبانی وعظ اور تذکیر جہاں بہت سے لوگوں پر اثر کرتا اور ان کے دلوں میں تغیّر پیدا کر دیتا ہے وہاں ایک طبقہ انسانوں کا ایسا بھی ہوتا ہے جو زبانی وعظ و تذکیر سے نصیحت حاصل نہیں کرتا اور وہ بعض اور ذرائع کا محتاج ہوتا ہے جو مُردہ قلوب میں زندگی اور جامد خیالات میں حرکت پیدا کریں- اس کے لئے دنیا نے کئی قسم کی ایجادیں کی ہیں- کہیں وعظ کو نثر سے لے کر شعر میں بدل دیا ہے' کہیں شعر سے ڈرامے کی صورت میں بدل دیا- پھر جب دیکھا ہے کہ اس کا بھی پورا اثر نہیں ہوتا تو لفظی ڈرامے کو تمثیلی ڈرامے میں تبدیل کر دیا ہے- ایک اسٹیج بنا دیا جاتا ہے اور اس پر مختلف قسم کے لوگ آتے ہیں- کوئی بادشاہ بن جاتا ہے' کوئی وزیر بن جاتا ہے' کوئی حاجب بن جاتا ہے' کوئی مسخرہ بن جاتا ہے' کوئی تاجر بن جاتا ہے' کوئی بیچنے والا بن جاتا ہے' کوئی خریدار بن جاتا ہے' کوئی حاسد بن جاتا ہے' کوئی محسود بن جاتا ہے' کوئی عاشق بن جاتا ہے' کوئی معشوق بن جاتا ہے غرض مختلف شکلوں میں وہ انسانی جذبات کو ممثّل کرتے ہیں یعنی ایکٹ کر کے دکھاتے اور نقل اتارتے ہیں اور خیال کیا جاتا ہے کہ یہ نقل دنیا میں بہترین اثر کرنے والی چیز ہے اور اس اثر کو اتنا وسیع قبول کیا گیا ہے کہ اس زمانہ میں اس کو ترقی کا واحد ذریعہ سمجھ لیا گیا ہے- چنانچہ گورنمنٹوں نے اب اپنے تمثیل خانے بنائے ہوئے ہیں جن میں ایکٹ کیا جاتا ہے پھر ان کی فلم لی جاتی ہے اور وہ فلم مختلف تھیئٹروں سے لوگوں کو دکھائی جاتی ہے- روس کی تمام ترقی اور جدوجہد کی بنیاد ہی تمثیلات' ایکٹنگ اور تھیئٹر پر ہے- مذہب کے خلاف بھی وہ اس سے پروپیگنڈا کرتے ہیں' سیاسیات کے متعلق بھی وہ اس سے پروپیگنڈا کرتے ہیں اور دنیا کے تمدنی اور اقتصادی حالات کے متعلق اپنی تدابیر کی تائید میں بھی وہ اس سے پروپیگنڈا کرتے ہیں- فلسفے کے باریک نُکتے جب کتابوں میں ہوتے ہیں تو ان کے سمجھنے کے لئے عالم دماغوں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن وہی نکتے جب تھیئٹر کی سٹیج پر آجاتے

ہیں تو ایک بچہ بھی ان کو سمجھ لیتا ہے۔ اس نکتہ کو سمجھتے ہوئے انہوں نے اپنے اصول کی بنیاد ہی سینما پر رکھی ہے۔ چنانچہ گاؤں گاؤں میں انہوں نے سینما کھولے ہوئے ہیں جن کے ذریعہ لوگوں کو ان چیزوں کے عیوب دکھائے جاتے ہیں جن کے خلاف روس کی حکومت ہے اور ان چیزوں کے محاسن دکھائے جاتے ہیں جن کی تائید میں بالشوزم[1] ہے۔ اسی طرح مذہب کے خلاف منافرت کے جذبات پیدا کرنے کے لئے بھی وہ سینما سے کام لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ خدا تعالیٰ کی تمثیل بھی دکھاتے ہیں اور فلم کے پردہ پر اسے پیش کرتے ہیں' پھر اس پر جرح کرتے ہیں اور کہتے ہیں تو لوگوں کو مارتا ہے' تو ان پر قحط نازل کرتا ہے' تو ان کی ہلاکت کے لئے وبائیں بھیجتا ہے' تو طاعون سے لوگوں کو موتیں دیتا ہے' تو لڑائیاں ڈالتا اور فساد پیدا کرتا ہے۔ غرض اسی طرح وہ خدا تعالیٰ پر جرح کرتے ہیں اور آخر لینن[2] کو پریذیڈنٹ بنا کر اس کے ذریعہ یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ نعوذ باللہ اس خدا سے زیادہ ظالم اور مضرّت رساں اور کوئی وجود نہیں پھر اس کے بعد خدا کو پھانسی دے دی جاتی ہے۔ یہ تمثیل جب بچے دیکھتے ہیں تو گو اس کے پسِ پردہ غلط خیالات کام کر رہے ہیں مگر چونکہ یہ نہایت ہی بھیانک اور ڈرانے والے نظارے ہوتے ہیں اس لئے وہ ان باتوں کو اپنے دل میں جذب کر لیتے ہیں اور جب وہ جوانی کو پہنچتے ہیں تو بغیر اس کے کہ یورپین فلسفیوں کی کتابیں انہوں نے پڑھی ہوں وہ پکّے دہریہ ہو چکے ہوتے ہیں۔

غرض تمثیلی زبان دنیا میں ایک اہم زبان ہے اور اسی اہمیت کی وجہ سے مذاہب نے بھی تمثیلات اختیار کی ہیں۔ مثلاً ہندوؤں میں دُسہرہ[3] ہے اس میں تمثیلی زبان میں جہاں اپنے باپ دادوں کی قربانیوں کا نمونہ دکھایا جاتا ہے وہاں بدی کا انجام آخر آگ میں جلنا قرار دیا جاتا ہے چنانچہ وہ راون کی مورتی جلاتے ہیں اور اس طرح تمثیلی زبان میں اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ جو شخص حق کے خلاف چلتا ہے آخر آگ میں جلتا ہے۔ یہی تمثیلی نظارہ ہولی میں نظر آتا ہے اور یہی تمثیلی نظارہ مسلمانوں میں محرم کے دنوں میں نظر آتا ہے۔ گیارہ مہینے شیعہ سنّیوں کے سامنے نہایت زور دار رنگ میں اپنے دلائل پیش کرتے اور انہیں شیعیت کی طرف مائل کرتے رہتے ہیں مگر سنی ان باتوں کو ایک کان سے سنتا اور دوسرے کان سے نکال دیتا ہے لیکن بارھویں مہینے جب شیعہ تعزیہ نکالتے ہیں اور وہ ساتھ ساتھ پیٹتے جاتے ہیں تو ان کی گیارہ مہینوں کی محنت کے مقابلہ میں اس ایک دن قریباً سارے سنی شیعہ نظر آتے ہیں اور اس دن یہ فرق نہیں کیا جا سکتا کہ شیعہ کون ہے اور سنی کون؟ سوائے اس کے کہ فساد کے دن ہوں اور شیعہ

سنی ایک دوسرے سے الگ ہوں ورنہ عام حالات میں ان میں فرق کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے اور بظاہر جو کچھ نظر آتا ہے وہ یہی ہوتا ہے کہ اگر شیعہ ہو تو اس کی آنکھوں میں بھی آنسو ہوتے ہیں اور اگر کوئی سنی ہو تو اس کی آنکھوں میں بھی آنسو ہوتے ہیں فرق صرف درجے کا ہوتا ہے۔ یعنی شیعہ ظاہر میں پیٹتا جاتا ہے لیکن سنی کا دل پیٹتا جاتا ہے لیکن بہرحال ہوتے سارے ہی متأثر ہیں اس لئے کہ تمثیلی زبان میں کربلا کے واقعات اور ان کے نتائج سب کو دکھا دیئے جاتے ہیں۔ پھر بعض جگہ یہ تمثیلی زبان اتنی بڑھا دی گئی ہے کہ حیدر آباد میں محرم کے دنوں میں کسی زمانہ میں یزیدی لشکر کو ریچھ بندر اور سؤر کی شکل میں دکھایا جاتا تھا اور یہ نظارہ اس قدر بھیانک ہوتا تھا کہ جن لوگوں کے جذبات واقعاتِ کربلا سے متأثر نہیں ہوتے تھے ان پر اس کا اُلٹا اثر ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک یورپین اسلام کی تعلیم کا مطالعہ کرنے کے بعد اسلام کی طرف بہت کچھ مائل ہو گیا اور اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اسلامی ممالک کو بھی دیکھنا چاہئے۔ جب وہ حیدر آباد پہنچا تو اس کی بدقسمتی سے وہ محرم کے ایام تھے اور لوگوں کا ایک حصہ وہاں بندر، سؤر اور کتے بن کر پھر رہا تھا۔ وہ یہ نظارہ دیکھتے ہی اسلام سے متنفر ہو گیا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ کتابی اسلام اور حقیقی اسلام میں بہت بڑا فرق ہے اور ہر شخص جو اسلام کے متعلق کتابیں پڑھے اس کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ عمل میں بھی مسلمانوں کو دیکھے اور پھر اس مذہب کے متعلق اپنی رائے قائم کرے۔ مگر یہ ان لوگوں کا حال ہے جن کے جذبات ان واقعات سے متأثر نہیں ہوتے۔ وہ لوگ جن کے جذبات ان واقعات سے متأثر ہوتے ہیں وہ اس قسم کی لغویات کی بھی پروا نہیں کرتے۔ علم النفس کے ماہرین نے اس امر پر بحث کی ہے کہ کیا وجہ ہے کہ انسانی طبیعت پر تمثیلات کا زیادہ اثر ہوتا ہے اور انہوں نے آخر یہ وجہ قرار دی ہے کہ تمثیلی زبان پہلے تھی اور لفظی زبان بعد میں پیدا ہوئی۔ یعنی پہلے پہل جب انسان نے دنیا میں ہوش سنبھالا تو چونکہ اس کی کوئی زبان نہیں تھی اس لئے وہ اپنے خیالات ہاتھوں اور اشاروں سے ظاہر کرتا اور بجائے زبان سے کچھ کہنے کے عمل کر کے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا کرتا تھا اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ جتنی کوئی پرانی چیز ہو اتنا ہی اس کا دل پر گہرا نقش ہوتا ہے۔ تو چونکہ زبان بعد کی ایجاد ہے اس لئے اس کا اتنا گہرا اثر نہیں ہوتا جتنا تمثیلی زبان کا جو پرانی ہے ہوتا ہے۔ گویا پرانے زمانے میں جب تک زبان ایجاد نہیں ہوئی تھی تمام باتیں ایکٹ کر کے کی جاتی تھیں۔ جیسے ماں جب اپنے بچے کو کہتی ہے تو مجھے پیارا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ ماں مجھ سے پیار

183

کرتی ہے لیکن یہ موجودہ زمانہ کی زبان ہے۔ ابتداء میں جب ابھی یہ زبان ایجاد نہیں ہوئی تھی جب ماں نے اپنے بچے سے یہ کہنا ہوتا کہ تو مجھے پیارا ہے تو وہ اسے چومتی تھی اور اس کا بیٹا سمجھتا تھا کہ میری ماں مجھ سے پیار کر رہی ہے لیکن اب اس زمانہ کی یادگار صرف چومنا رہ گیا ہے ورنہ اظہار محبت کے بہت سے الفاظ پیدا کر لئے گئے ہیں۔ پس تمثیلی زبان پرانی ہے اور لفظی زبان نئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ تمثیلی زبان کا عوام الناس پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ بعض دوستوں نے بتایا کہ ڈیرہ غازیخاں میں کسی کو کتنی گالیاں دے لی جائیں وہ ان کو برداشت کرتا چلا جائے گا لیکن اگر اسے جوتی اٹھا کر دکھا دو تو قتل تک نوبت پہنچ جاتی ہے حالانکہ گالیوں کے مقابلہ میں جوتی دکھانا زیادہ اہم نہیں لیکن وہاں جوتی کا تلا دکھا دینا خونریزی پیدا کرنے والی بات ہو جاتی ہے۔ غرض تمثیلات کا اثر انسانی زندگی پر بہت گہرا ہوتا ہے۔ اسلام نے بھی اس اثر کو ایک رنگ میں ظاہر کیا ہے لیکن اسلام میں اور دوسرے مذاہب میں ایک فرق ہے دوسرے مذاہب تمثیل ایسے رنگ میں دکھاتے ہیں جب وہ کھیل اور تمسخر ہوتی ہے مگر اسلام نے اسے ایسے رنگ میں لیا ہے جب وہ کھیل اور تمسخر نہیں بلکہ حقیقت ہوتی ہے۔ شاید تمہارے لئے یہ بات بغیر مثال کے سمجھنی مشکل ہو اس لئے میں اس کی وضاحت کے لئے ایک مثال دے دیتا ہوں۔ اگر کسی سنگدل کو یہ بتانا ہو کہ محبت بنی نوع انسان سے کیا قربانی کرواتی ہے تو اس کی ایک صورت یہ ہے کہ ایک تھیٹر بنا دیا جائے اور اس پر ایک اجنبی جس کا دوسرے سے کوئی رشتہ نہیں باپ بن جائے اور ایک شخص جس کا اس سے کوئی رشتہ نہ ہو بیٹا بن جائے اور یہ دکھایا جائے کہ بیٹا چارپائی پر بیمار لیٹا ہے اور مصنوعی باپ اسے دوائی پلا رہا ہے اور اس کی بیماری کے درد سے متأثر ہو کر روتا جا رہا ہے۔ لیکن دوسری صورت یہ ہے کہ بجائے مصنوعی تماشہ دیکھنے کے کوئی شخص دریافت کرے کہ شہر میں کوئی بیمار ہے یا نہیں اور جب اسے کسی بیمار کا حال معلوم ہو تو وہ اس کے حال کے دریافت کے لئے اس کے گھر جائے اور دیکھے کہ اس بیمار بچے کے ماں باپ کا کیا حال ہے اور ان کی غم کے مارے کیا کیفیت ہے۔ اب پہلے نے بھی تمثیلی زبان میں ایک نظارہ دکھایا اور دوسرے نے بھی لیکن پہلے نے جو کچھ دکھایا وہ محض تماشہ تھا لیکن دوسری جگہ اسے جو کچھ نظر آیا وہ حقیقت تھی۔ پہلے نظارہ کے دیکھنے سے جہاں انسانی طبیعت پر ایک اچھا اثر پڑتا ہے وہاں اندرونی طور پر یہ بھی اثر پڑتا ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ جذبات سے بھی مذاق کیا جا سکتا ہے۔ جب ہم جانتے ہیں کہ ایک شخص باپ نہیں اور ہم جانتے ہیں کہ ایک

شخص بیٹا نہیں اور وہ مصنوعی طور پر ایک نظارہ پیش کر رہے ہیں تو ہم اعلیٰ سے اعلیٰ اور قیمتی سے قیمتی جذبات کو کھیل میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان چیزوں کا ایک ظاہری اثر بھی ہوتا ہے لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ لوگ اس طرح نقال بن جاتے ہیں۔ گویا اس چیز کا دوہرا اثر ہوتا ہے اور وہ دودھاری تلوار ہے جو ایک طرف جہاں اعلیٰ جذبات کو ابھارتی ہے وہاں دوسری طرف بعض اعلیٰ جذبات کو کچل بھی دیتی ہے اور ہنسی اور تمسخر کی طرف انسان کو مائل کر دیتی ہے۔ چنانچہ ایکٹروں کی زندگی دکھ لو۔ وہی ایکٹر جو ایکٹنگ کے وقت رو رہا ہوتا ہے جب اس جگہ سے الگ ہوتا ہے تو بسا اوقات سیدھا شراب خانے کا رخ کرتا اور اپنی محبوبہ سے عیش و عشرت میں مشغول ہو جاتا ہے لیکن اگر تم اس گھر کو دیکھو جہاں ماں باپ اپنے بیمار بچے کے پاس اس کی تیمارداری میں مشغول تھے اور ایک دو گھنٹے کے بعد پھر ان کے حالات کا جائزہ لو تو تمہیں وہاں اور بھی فکر و ملال کے آثار نظر آئیں گے۔ پھر جب اس سٹیج پر تمہیں یہ نظارہ دکھائی دے کہ بیمار لڑکا مر گیا ہے اور ایکٹر رو رہے ہیں تو اس کے ساتھ ہی تمہیں یہ بھی نظر آئے گا کہ تھوڑی دیر کے بعد وہی رونے والے کھانے پینے اور ہنسی مذاق میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ گھر جہاں واقعہ میں کوئی موت ہو جائے اگر اس گھر میں جا کر دیکھو تو تمہیں معلوم ہو گا کہ ماں افسردہ ہے' اس کے کپڑے میلے کچیلے ہیں' اسے نہ کھانے کا ہوش ہے نہ پینے کا' رات دن وہ گریہ و بکا میں مشغول رہتی ہے یہاں تک کہ زمانہ آپ ہی آپ اس کا غم مٹا دیتا ہے۔ تو اس جگہ انسانی طبیعت پر جو اثر پڑے گا وہ ایک ہی رنگ کا ہو گا اور اچھا ہی ہو گا۔ مگر جہاں ایکٹ کر کے کوئی واقعہ دکھایا جاتا ہو اس کے دیکھنے سے دو طرح کا اثر پڑے گا ایک اچھا اور ایک برا۔ اسلام نے اس نکتہ کو سمجھتے ہوئے نقل سے منع کیا ہے اور رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص کوئی ہنسی مذاق کا کام اس لئے کرتا ہے تاکہ دوسرے کو ہنسائے اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔[۴] گویا مصنوعی ایکٹنگ کو رسول کریم ﷺ نے لعنت کا باعث قرار دیا ہے۔ ہاں اس ایکٹنگ کو رسول کریم نے لعنت کا باعث قرار نہیں دیا جہاں تمثیلی زبان میں فطرت اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے سوائے اس کے کہ وہ اظہار حد سے زیادہ ہو۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ کا ہی واقعہ ہے۔ آپ ہمیشہ لوگوں کو صبر کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ مگر آپ کا ایک نواسہ ایک دفعہ شدید بیمار ہوا۔ آپ کی بیٹی کی طرف سے آپ کو کئی دفعہ پیغام پہنچا کہ بچے کو آ کر دیکھ جائیں۔ مگر چونکہ آپ کی طبیعت رقّت والی تھی اس لئے آپ نہ گئے مگر آخری

دفعہ اس نے بہت اصرار کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیغام بھیجا اور آپ تشریف لے گئے۔ اس وقت بچہ پر نزع کی حالت طاری تھی آپ نے اسے گود میں اٹھایا اور آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے جب آپ کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے تو ایک شخص نے کہا۔ یا رسول اللہ (ﷺ) آپ تو لوگوں کو صبر کی تلقین فرمایا کرتے ہیں آپؐ اس موقع پر کیوں رو رہے ہیں؟ رسول کریم ﷺ نے فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ نے رقیق القلب بنایا ہے اگر تیرے دل کو اس نے سخت بنایا ہے تو میں کیا کروں۔ ؁۵ یہ تمثیلی زبان تھی جس میں رسول کریم ﷺ کی فطرت نے اپنے آپ کو ظاہر کیا۔ آنسو کیا ہیں؟ وہ تمثیلاً محبت کے اظہار کا ایک ذریعہ ہیں۔ جن میں فطرت اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے اور فطرت چونکہ حقیقی چیز ہے اس لئے جو اثر اس میں ہوتا ہے وہ چمڑے کی زبان میں نہیں ہوتا۔

یہ جو عید کا موقع ہے یہ بھی اللہ تعالیٰ نے ایک تمثیل پیش کی ہے اور اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے کئی سبق دیئے ہیں۔ مگر وہ سبق جو آج میں بیان کروں گا اگر اس کو جماعت کے لوگ اپنے ذہن میں **مستحضر** رکھیں تو ان کی جماعتی زندگی میں بہت بڑا تغیر پیدا ہو سکتا ہے۔ دیکھو ہم تیس دن روزے رکھتے ہیں یا ۲۹ دن روزے رکھتے ہیں اور ۲۹ یا ۳۰ دنوں کے بعد ایک دن ایسا آتا ہے جب ہم عید مناتے ہیں گویا تمثیلی زبان میں ہم اقرار کرتے ہیں کہ دنیا کی ساری خوشیاں قربانی کے بعد پیدا ہوتی ہیں جب تک ہم قربانی نہ کریں اس وقت تک ہم حقیقی خوشی دیکھ ہی نہیں سکتے۔ مگر دیکھو تیس دن کے جو روزے ہیں ان میں کیا خدا کا یہ قانون ہے کہ کوئی مسلمان نہ مرے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ باقی گیارہ مہینوں میں تو مسلمان مرتے رہتے ہیں مگر اس بارھویں مہینہ میں مسلمان نہیں مرتے۔ یقیناً اس بارھویں مہینہ میں بھی اسی طرح مسلمان مرتے ہیں جس طرح باقی گیارہ مہینوں میں۔ پس رمضان کے مہینہ میں ان مسلمانوں کا بارھواں حصہ فوت ہوتا ہے جو سال کے باقی مہینوں میں فوت ہوتے ہیں۔ مسلمان اس وقت دنیا بھر میں چالیس کروڑ ہیں۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ ایک فیصد آدمی روزانہ مرتا ہے تو سال بھر میں چالیس لاکھ آدمی مرجاتے ہیں۔ اب اگر ہم اس تعداد کو مہینوں میں تقسیم کریں تو سوا تین لاکھ مسلمان ایسے بنتے ہیں جو ہر مہینہ میں مرتے ہیں اور اس لحاظ سے رمضان میں بھی سوا تین لاکھ مسلمان مرتے ہیں۔ کچھ لمبی بیماریوں' سے کچھ فوری بیماریوں سے' کچھ اتفاقی حادثات سے' پھر ان میں سے بھی کوئی دو روزے رکھ کر مرجاتا ہے کوئی تین روزے رکھ کر مرجاتا ہے' کوئی چار

روزے رکھ کر مرجاتا ہے' کوئی چھ روزے رکھ کر مرجاتا ہے' کوئی سات' کوئی آٹھ' کوئی دس' کوئی پندرہ' کوئی بیس' کوئی اکیس' کوئی بائیس' کوئی تیئس' کوئی چوبیس' کوئی پچیس' کوئی چھبیس' کوئی ستائیس' کوئی اٹھائیس اور کوئی انتیس روزے رکھ کر مرجاتا ہے۔ اب فرض کرو کسی نے انتیس ۲۹ روزے رکھے تھے کہ وہ گھر سے نکلا اور موٹر سے ایسا ٹکرایا کہ وہیں فوت ہو گیا' یا اسے ہیضہ ہوا اور وہ مرگیا' یا اسے کسی اتفاقی حادثہ سے آگ لگ گئی' یا اس کا ہارٹ فیل ہوگیا تو گویا وہ انتیس ۲۹ روزے رکھ چکا تھا اور اس بات کی امید کر رہا تھا کہ مجھے اس کے بعد عید ملے گی مگر انتیس ۲۹ روزوں کے بعد اس کی عید کہاں گئی؟ اسے نہ صرف خود عید نہ ملی بلکہ اس کے گھر کی عید بھی خراب ہو گئی۔ غرض اسی طرح سوا تین لاکھ آدمی رمضان میں ایسا مرتا ہے جو عید کی تیاری تو کرتا ہے مگر اسے عید میسر نہیں آتی۔ مگر کیا اس امر کو دیکھتے ہوئے باقی مسلمان روزے رکھنا چھوڑ دیتے ہیں؟ اور کیا وہ یہ کہا کرتے ہیں کہ ہم کیوں روزے رکھیں ہمیں کیا پتہ ہمیں عید ملے گی یا نہیں؟ وہ باوجود یہ نظارے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے وہ باوجود اس کے کہ وہ یقینی اور قطعی طور پر سمجھتے ہیں کہ ہم میں سے ایک تعداد ایسی ہے جسے عید میسر نہیں آسکتی پھر بھی روزے رکھتے اور قربانیاں کرتے ہیں اس لئے کہ جو قومی زندگی کا طریق ہے وہ فردی نتائج کو نہیں دیکھا کرتا۔ اگر ساری قوم قربانیاں نہیں کرے گی تو کسی کو بھی عید میسر نہیں آئے گی۔ لیکن اگر ساری قوم قربانیاں کرے گی تو بعض کو عید ملے گی اور بعض کو نہیں ملے گی۔ یہ سبق ہے جو تمثیلی زبان میں عید کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دیا اور بتایا کہ جب تم اجتماعی کاموں کے لئے کوشش کرتے ہو تو یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر فرد کی قربانی اس کی زندگی میں نتیجہ پیدا کردے۔ بالکل ممکن ہے کہ ایک تعداد قربانیاں کرے مگر نتیجہ کچھ بھی نہ دیکھے اور کچھ دوسرے قربانیاں کریں اور ان کا نتیجہ انہیں مل جائے۔ تو قومی کاموں کے نتائج افراد کے لحاظ سے نہیں دیکھنے چاہئیں۔ جو قومیں یہ سبق سیکھ لیتی ہیں وہ عیدوں پر عیدیں دیکھتی چلی جاتی ہیں۔ مگر جو قومیں اس سبق کو بھلا دیتی ہیں وہ اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ جرمنی اور انگلستان کی لڑائی ہوئی اور اس میں دو کروڑ آدمی یا زخمی ہوا یا مارا گیا۔ اٹھارہ' بیس بیس' پچیس پچیس' تیس تیس اور چالیس چالیس سال کی عمر سے لے کر بڑھاپے تک کی عمر کے لوگ اس جنگ میں شامل ہوئے اور مارے گئے۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے بچے چھوڑ کر میدان جنگ میں چلے گئے' ایسے بھی تھے جو اپنی بیویاں چھوڑ کر میدان جنگ میں چلے

گئے‘ ایسے بھی تھے جو اپنے ماں باپ چھوڑ گئے چنانچہ انگلستان کا سب سے بڑا شاعر بلکہ حقیقتاً دنیا کا سب سے بڑا شاعر رڈیارڈ کپلنگ [۷] کا ایک ہی بیٹا تھا جو اس جنگ میں مارا گیا۔ اسی طرح انگلستان کا سب سے بڑا ناولسٹ یا کم سے کم ان ناولسٹوں میں سے ایک ناولسٹ جس کی کتابیں بالعموم پڑھی جاتی ہیں کانن ڈائل [۷] تھا جس کا ایک ہی لڑکا تھا اور وہ بھی اس جنگ مین مارا گیا تھا۔ کانن ڈائل پر اس کی موت کا ایسا اثر ہوا کہ وہ اسی اثر کے نتیجہ میں صوفی بن گیا اور مردہ روحوں کو بلانے کا شغل اس نے اختیار کر لیا۔ گویا بڑھاپے میں اس صدمے کا اس کے دماغ پر ایسا اثر ہوا کہ ایک قسم کا جنون اسے ہو گیا اور اس جنون میں جو جو آوازیں اس کے کان میں پڑ جاتیں انہیں سنکر وہ خوش ہو جاتا اور خیال کرتا کہ میرا بیٹا مجھ سے بول رہا ہے۔ رڈیارڈ کپلنگ کی بھی ایسی ہی حالت ہو گئی اور اس کی زندگی میں بہت بڑا تغیر واقع ہو گیا۔ چنانچہ اس کا ایک بہت قریبی رشتہ دار لارڈ بارلو جو لارڈ بالڈون [۸] کا رشتہ دار تھا لکھتا ہے کہ میں نے اس کے بعد اسے ہنستے ہوئے کبھی نہیں دیکھا حالانکہ وہ اس سے پہلے ہنسوڑ تھا اور ہمیشہ بچوں کے متعلق کتابیں لکھا کرتا تھا۔ مگر اس صدمے کا اثر اس پر ایسا ہوا کہ ساری عمر پھر اسے کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے لڑائی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اگر کسی کے گھر کا ایک چراغ تھا تو وہ ایک چراغ بھی اس لڑائی کی وجہ سے بجھ گیا مگر رڈیارڈ کپلنگ سے ہی بعد میں کسی نے دریافت کیا کہ کیا اب تم لڑائی کے مخالف ہو گئے ہو تو وہ کہنے لگا نہیں اگر پھر ویسے ہی حالات پیدا ہو جائیں تو میں پھر لوگوں کو لڑائی کی ترغیب دوں گا اور انہیں قربانیوں پر آمادہ کروں گا۔ غرض اس لڑائی کا نتیجہ انہوں نے نہیں دیکھا بلکہ ان کی قوم نے دیکھا لیکن چونکہ ان کی قوم کو اس کا فائدہ حاصل ہو گیا اس لئے انہوں نے سمجھا کہ ہمیں بھی وہ فائدہ حاصل ہو گیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی تمام امیدیں ان کی دنیوی زندگی سے وابستہ ہیں‘ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اخروی زندگی پر کوئی یقین نہیں اور جو سمجھتے ہیں کہ انہیں جو کچھ ملنا تھا وہ مل گیا اور جو نہیں ملا وہ اب نہیں مل سکتا۔ مگر باوجود اس کے انہوں نے کہا لڑائیاں قوم کی خاطر ہوتی ہیں اگر قوم کی فتح ہو گئی ہے تو یہی فتح حقیقی ہے۔ جرمنی اور انگلستان کی لڑائی کے ابتدائی ایام میں ایک اخبار میں میں نے پڑھا۔ ایک جرمن بڑھیا جس کی اسّی سال عمر تھی اس کا ایک ہی لڑکا تھا جو جنگ میں شامل ہوا اور مارا گیا۔ وہ بڑھیا چونکہ اچھی حیثیت رکھتی تھی اور گورنمنٹ کا خیال تھا کہ اس کی دلجوئی کی جائے اس لئے وزیرِ جنگ کی طرف سے اسے چِٹھی ملی کہ مجھ سے آکر ملو

اور فیصلہ کیا گیا کہ وزیر جنگ خود اس کا اعزاز کرے اور اسے اس کے بیٹے کی موت کی خبر دے۔
چنانچہ وہ بڑھیا آئی اور وزیر جنگ نے بادشاہ کی طرف سے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ تم نے
بڑی سے بڑی قربانی اپنے ملک کے لئے پیش کر دی تھی مگر افسوس کہ تمہارا لڑکا اس جنگ میں
مارا گیا ہے۔ لکھا ہے کہ جب وہ بڑھیا یہ خبر سن کر باہر نکلی تو اس کا جسم غم سے ایسا کانپ رہا تھا کہ
اس سے کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا اور اس کی کمر جھکی چلی جا رہی تھی مگر یہ دکھانے کے لئے کہ کیا ہوا
اگر میرا بیٹا مارا گیا ہے وہ مصنوعی ہسٹیریکل ہنسی ہنستی اور قہقہہ مارتے ہوئے کہتی اگر میرا بیٹا مر
گیا ہے تو کیا ہوا وہ قوم اور ملک کے لئے قربان ہوا ہے۔ اور باوجود اس کے کہ یہ نظارہ دیکھنے
والا جرمن قوم کا ایک دشمن تھا وہ لکھتا ہے کہ یہ نظارہ دیکھ کر ہمیں بے اختیار آنسو آ گئے۔
اب دیکھو ادھر اندرونی صدمہ اسے سخت تھا کہ اس سے کھڑا بھی نہیں ہوا جاتا تھا اور دوسری
طرف وہ لوگوں کو دکھانے کے لئے زور سے اپنی لکڑی پر سہارا لیتی اور قہقہہ مارتی ہوئی کہتی کہ
کیا ہوا اگر میرا بیٹا مر گیا ہے وہ ملک کی خاطر ہلاک ہوا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن سے اخروی
زندگی میں انعام کا کوئی وعدہ نہیں، جنہیں اخروی زندگی پر کوئی یقین نہیں، جن کی عمریں لوگوں
کو یہ بتاتے ہوئے گذر گئیں کہ موت کے بعد کوئی حیات نہیں وہ قربانی کرتے ہیں اور قربانی
کرنے کے بعد عید کا دن ان کو نصیب نہیں ہوتا مگر پھر بھی وہ قربانی سے دریغ نہیں کرتے اور
ان میں سے کوئی نہیں کہتا کہ ہمیں بتاؤ ہمیں اس قربانی کا کوئی انعام بھی ملے گا یا نہیں۔ وہ جانتے
ہیں کہ ہماری قوم کی زندگی ہماری زندگی ہے۔ ان کے اندر یہ احساس پیدا ہو چکا ہے کہ ہمارے
دو وجود ہیں ایک فردی اور ایک قومی۔ جس طرح ایک ہاتھ دوسرا ہاتھ بچانے کے لئے کٹ جاتا
ہے اور اگر اس ہاتھ کا دماغ ہوتا تو وہ کہتا کہ مجھے اپنے کاٹے جانے کی پروا نہیں اگر میں کٹ گیا تو
کیا ہوا باقی جسم تو بچ گیا ہے اسی طرح قومی زندگی کا احساس جن لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو جاتا
ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ہم فرد نہیں بلکہ قوم کے جسم کا ایک حصہ ہیں۔ ہم انسان نہیں بلکہ انسان
احمدیت ہے اور وہ اپنے آپ کو اس احمدیت کے اعضاء میں سے ایک عضو سمجھتے اور اپنی قربانی
کا شمار کسی حساب میں نہیں سمجھتے۔ جس طرح کسی کا ناک کٹ جائے یا آنکھ نکل جائے مگر وہ
اپنے دشمن پر فتح حاصل کر لے تو وہ خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے کیا ہوا اگر میرا ناک کٹ گیا یا
میری آنکھ نکل گئی دشمن پر تو میں غالب آ گیا۔ اسی طرح وہ لوگ جو اپنے آپ کو قوم کے اعضاء
سمجھتے ہیں وہ اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ ان کا کیا انجام ہوا وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی قوم کو فتح

حاصل ہوئی ہے یا نہیں اور جب اسے فتح حاصل ہو جاتی ہے تو وہ اپنی ہر قربانی بے حقیقت سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو ایک عضو تھے اگر ایک عضو نہیں رہا تو کیا ہوا جسم نے تو فتح پائی ہے۔ غرض وہ لوگ جو قومی زندگی میں شریک ہوتے ہیں وہ یہ احساس کرنے لگ جاتے ہیں کہ ہمارے دو وجود ہیں ایک فردی جو ادنیٰ ہے اور ایک قومی جو اعلیٰ ہے۔ ہم قومی وجود کے مقابلہ میں ایسے ہی ہیں جیسے جسم کے مقابلہ میں کوئی عضو۔ ہم آدمی نہیں بلکہ آدمی کے کان ہیں' ہم آدمی کے ہاتھ ہیں' ہم آدمی کا ناک ہیں اور ہم آدمی کا دل و دماغ اور جگر ہیں اگر ہم سارے کے سارے بھی اپنے جسم کو بچانے کے لئے کٹ جاتے ہیں تو ہم کوئی قربانی نہیں کرتے کیونکہ جسم کے بچ جانے کے بعد عزت بہرحال ہماری ہوگی۔ یہ شعور جس قوم میں پیدا ہو جاتا ہے وہی سچی قربانی کرتی ہے۔ پس روزوں نے تمثیلی زبان میں ہمیں یہ نظارہ دکھایا ہے کہ لوگ سارے روزے رکھتے ہیں مگر عید بعض کو میسر آتی ہے اور بعض کو نہیں آتی۔ کچھ عید سے پہلے چل بستے ہیں' کچھ پہلے روزے کے بعد' کچھ دوسرے روزے کے بعد' کچھ پندرھویں روزے کے بعد' کچھ اٹھائیسویں یا انتیسویں روزے کے بعد اور کوئی نہیں کہتا کہ روزے رائیگاں گئے کیونکہ قوم کو عید بہرحال مل گئی۔ یہ تمثیلی اثر ہے جو ذہنوں پر رمضان نے پیدا کیا مگر کم لوگ ان باتوں کو دیکھتے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ انہوں نے حکمت پر کبھی غور نہیں کیا ہوتا اور چونکہ وہ غور کرنے کے عادی نہیں ہوتے اسی لئے وہ فائدہ بھی نہیں اٹھاتے۔

پس آج میں جماعت کو اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہوں کہ اپنی قربانیوں کی طرف کبھی اس نقطۂ نگاہ سے خیال نہ کرو کہ ان سے اس فرد کو فائدہ پہنچے گا جس نے قربانی کی۔ قربانیاں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک فردی اور ایک قومی۔ فردی قربانیاں فرد کی زندگی کو چاہتی ہیں مگر قومی قربانیاں قوم کی زندگی کو چاہتی ہیں۔ جیسا کہ اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے ہماری ایک قوم بنا دی ہے جو احمدیت ہے۔ پس ہمیں اس نقطہ نگاہ سے اپنی قربانیوں کو نہیں دیکھنا چاہئے کہ ہمیں ان قربانیوں سے اپنی زندگیوں میں کیا فائدہ ہوگا بلکہ ہمیں اس نقطہ نگاہ سے دیکھنا چاہئے کہ میں احمدیت کا فرد ہوں اور اگر مجھے عید کا دن دیکھنا نصیب نہ ہوا لیکن میری قوم نے دیکھ لیا تو وہ عید گویا مجھے ہی مل گئی۔ حضرت صاحبزادہ عبداللطیف صاحب شہید نے احمدیت کے لئے اپنی جان دی ان کی شہادت ۱۹۰۳ء میں ہوئی ان کے بھی اس وقت بچے تھے بلکہ کئی بچے بعد میں بالغ ہوئے بلکہ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو ان کا ایک بچہ ان کی شہادت کے بعد پیدا ہوا۔ [۱۰] پس کیا

اس وقت ان کے سامنے ان کے بچے نہیں تھے یا ان کی بیوی نہیں تھی' تھے مگر وہ جانتے تھے کہ میں جب تک احمدیت میں شامل نہیں ہوا تھا ایک فرد تھا مگر احمدیت میں شامل ہونے کے بعد اب میں احمدیت کی انگلی یا اس کا ہاتھ بن گیا ہوں۔ پس آدمی ہونے کے لحاظ سے میری زندگی اور قسم کی تھی مگر احمدیت کا ایک عضو ہونے کے لحاظ سے اب میری زندگی اور رنگ کی ہے۔ اب میں دوسرے درجہ پر ہوں اور احمدیت پہلے درجہ پر۔ اور جس طرح جسم کو بچانے کے لئے کسی عضو کے کٹ جانے کی کوئی پروا نہیں کی جاتی اسی طرح احمدیت کی عزت بچانے کے لئے اگر میری جان چلی جاتی ہے تو وہ بے حقیقت شئے ہے۔ چنانچہ انہوں نے احمدیت کی عزت قائم رکھی اور خود شہید ہو گئے۔ اگر خدانخواستہ وہ اس وقت ثبات قائم نہ رکھ سکتے اور احمدیت سے انکار کر دیتے تو گو ان کی جان بچ جاتی مگر لاکھوں انسانوں کی نظر میں احمدیت کی وقعت کم ہو جاتی اور وہ یہ سمجھتے کہ یہ دین کوئی بڑا دین نہیں جب اس کے ایک متبع کو حقیقی ڈر پیدا ہوا تو اس نے احمدیت سے انکار کر دیا۔ مگر کیا تم سمجھ سکتے ہو کہ وہ انگلی جو اپنی زندگی کی پروا کرتی اور اپنے جسم پر دشمن کا وار ہونے دیتی ہے وہ بچ سکتی ہے؟ یہ تو ممکن ہے کہ انگلی مر جائے اور جسم بچ جائے مگر یہ بالکل ممکن نہیں کہ جسم مر جائے اور انگلی بچ جائے۔ یہ تو ممکن ہے کہ چاروں یا پانچوں انگلیاں کٹ جائیں اور جسم پھر بھی زندہ رہے مگر یہ ممکن نہیں کہ جسم پر موت آ جائے اور انگلیاں محفوظ رہیں۔ ہزاروں آدمی ایسے ہیں جن کے دانت نکل جاتے ہیں' جن کی آنکھیں نکل جاتی ہیں' جن کے ہاتھ کٹ جاتے ہیں' جن کے پاؤں رہ جاتے ہیں مگر پھر بھی وہ زندہ رہتے ہیں۔ مگر تم یہ کبھی نہیں دیکھو گے کہ کسی کا جسم مر گیا ہو مگر اس کے ہاتھ یا پاؤں زندہ رہے ہوں۔ اسی طرح جب کوئی قوم قوم بنے گی اس وقت یہ تو ممکن ہو گا کہ افراد مریں اور قوم زندہ رہے مگر یہ ممکن نہیں ہو گا کہ قوم مر جائے اور افراد زندہ رہیں۔ اسی لئے عقلمند لوگ اپنی قربانیاں پیش کرتے اور اپنی قوم کو مرنے سے محفوظ رکھتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہماری موت میں ہماری قوم کی حیات ہے لیکن ہماری قوم کی موت میں ہماری اپنی بھی موت ہے۔ مگر یہ اس نقطہ نگاہ سے ہے اگر ہم سمجھیں کہ اگلا جہان کوئی نہیں لیکن اللہ تعالیٰ تو قرآن کریم میں مسلمانوں کے متعلق فرماتا ہے۔ **وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَالَا يَرْجُوْنَ** ؕ کہ تم دکھوں سے کیوں ڈرتے ہو یہ دکھ تم کو ویسے ہی پہنچتے ہیں۔ جیسے دشمنوں کو پہنچتے ہیں مگر وہ ان دکھوں سے نہیں ڈرتے بلکہ قربانیاں کرتے چلے جاتے ہیں پھر تم کیوں تکالیف سے ڈر کر قربانیاں کرنے سے

ہچکچاتے ہو۔ اس کے علاوہ تم میں اور ان میں ایک فرق بھی ہے اور وہ یہ کہ تم امید رکھتے ہو کہ جب ہم مریں گے تو جنت میں جائیں گے مگر تمہارا دشمن سمجھتا ہے کہ ہم مریں گے تو مٹی ہو جائیں گے۔ پس تمہاری قربانی تمہارے یقین کے مطابق ضائع نہیں گئی صرف یہ فرق ہوا کہ تمہاری عید اس جہان میں نہ ہوئی اگلے جہان میں ہو جائے گی۔

تو مومن قربانی میں بہت زیادہ دلیر ہوتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں نے اپنے آپ کو فنا کر دیا اور مجھے عید اس جہان میں نہ ملی تو اگلے جہان میں مل جائے گی لیکن کافر سمجھتا ہے کہ اگر مجھے اس جہان میں عید نہ ملی تو پھر کہیں بھی نہیں ملے گی۔ غرض یہ ایک بھاری سبق ہے جو رمضان سے حاصل ہوتا ہے۔ تمام مسلمان رمضان کے مہینہ میں روزے رکھتے ہیں مگر کئی ہیں جو روزوں میں ہی مر جاتے ہیں اور عید کو نہیں دیکھ سکتے۔ یہ مت خیال کرو کہ عید کے لئے کون روزے رکھتا ہے کیونکہ میں جب عید کا لفظ بولتا ہوں تو اس سے یہ کپڑوں اور کھانوں والی عید مراد نہیں ہوتی۔ اگر عید سے یہی عید مراد ہو تو کوئی اس عید کے لئے ایک دن کا بھی روزہ نہ رکھے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ظاہری عید وہ لوگ زیادہ مناتے ہیں جو روزے نہیں رکھتے۔ ہمارے ملک میں ایک مثل مشہور ہے جو دراصل ایسے ہی لوگوں کے متعلق ہے جو قربانی نہیں کرتے مگر انعام میں شامل ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کوئی لڑکی تھی جو روزے نہیں رکھتی تھی مگر سحری ضرور کھا لیا کرتی تھی۔ ایک دن اس کی مالکہ نے اسے کہا کہ تو خواہ مخواہ اپنی نیند کیوں خراب کرتی ہے۔ جب تو روزہ نہیں رکھتی تو سحری کیوں کھاتی ہے۔ وہ کہنے لگی 'بی بی نماز مَیں نہیں پڑھتی' روزہ مَیں نہیں رکھتی اب مَیں سحری بھی نہ کھاؤں تو کافر ہی ہو جاؤں۔ یہ ہے تو بظاہر ہنسی کی بات مگر حقیقتاً کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو رمضان کے روزے نہیں رکھتے' جو نمازیں نہیں پڑھتے مگر عید کے لئے سب سے پہلے پہنچ جاتے ہیں۔ گویا عملاً وہ یہی کہتے ہیں کہ ہم روزے بھی نہیں رکھتے' نمازیں بھی نہیں پڑھتے اب عید بھی نہ منائیں تو کافر ہی ہو جائیں۔ ان کے نزدیک ساری عبادت عید میں ہی ہے۔ پس روزہ دار اس عید کے لئے روزے نہیں رکھتا۔ روزہ دار جس عید کے لئے قربانی کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام دنیا میں قائم ہو جائے' روحانیت دنیا میں قائم ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی محبت دلوں میں قائم ہو جائے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ روزہ دار روزے اپنے لئے رکھتا ہے دنیا کے لئے نہیں رکھتا پھر اس کے روزوں کی یہ غرض کیونکر ہو سکتی ہے کہ دنیا میں اسلام اور روحانیت قائم ہو جائے۔ مگر میں کہتا ہوں اگر یہ

روزے افراد کے لئے ہوتے تو ایک مہینہ خاص طور پر کیوں مقرر کر دیا جاتا اور کیوں کہا جاتا کہ اسی ایک مہینہ میں سب لوگ روزے رکھیں۔ اس ایک مہینہ میں تمام مسلمانوں پر یہ واجب کر دینا کہ وہ روزے رکھیں بتاتا ہے کہ روزوں کا ایک حصہ جہاں افراد کے لئے ہے وہاں ایک حصہ اس کا قوم کے لئے بھی ہے تبھی اللہ تعالیٰ نے سب لوگوں کو روزوں پر لگا دیا تا قومی بیداری پیدا ہو۔ اگر افراد کے لئے روزے ہوتے تو یہ کیفیت پیدا نہ ہوتی اور ہر شخص کو اجازت ہوتی کہ جس مہینہ میں چاہے روزے رکھے۔ مگر اب ایک مہینہ میں سب کو اکٹھا کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان دنوں میں ایک قومی بیداری پیدا ہو جاتی ہے۔ بچے بھی سحری کے وقت اٹھ بیٹھتے ہیں اور گو روزہ نہ رکھیں مگر سحری کھا لیتے ہیں۔ اسی طرح ان دنوں میں مساجد لوگوں سے بھری رہتی ہیں لوگ تراویح پڑھتے ہیں' تہجد ادا کرتے ہیں' دعاؤں کرتے ہیں ؎۲ یہ شعور الگ الگ روزے رکھ کر پیدا نہیں ہو سکتا تھا اس لئے خدا تعالیٰ نے ایک مہینہ مقرر کر دیا اور حکم دے دیا کہ اس مہینہ میں سوائے معذوروں کے سب لوگ روزے رکھیں۔ ؎۳ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے نماز با جماعت ہے جو نماز فردی ہوتی ہے اس کے متعلق حکم ہے کہ جہاں جس کا جی چاہے پڑھ لے۔ چاہے تو گھر میں پڑھ لے اور چاہے تو مسجد میں پڑھ لے ؎۴ مگر نماز با جماعت کے لئے ایک امام مقرر کر دیا اور حکم دے دیا کہ سب لوگ اس کے پیچھے نماز پڑھیں۔ ؎۵ پس نماز با جماعت بھی فردی نہیں بلکہ قومی عبادت ہے اسی طرح رمضان کے روزے فردی عبادت نہیں بلکہ قومی عبادت ہیں۔ حج بھی فردی عبادت نہیں بلکہ قومی عبادت ہے۔ غرض جس عبادت کے ساتھ خدا تعالیٰ نے اجتماع کی شرط لگا دی ہے وہ شرط صاف بتاتی ہے کہ وہ قومی عبادت ہے اور جس کے ساتھ شرط نہ ہو وہ فردی عبادت ہوتی ہے۔ نفلی روزہ فردی عبادت ہے' گھر پر جو نمازیں پڑھی جاتی ہیں وہ فردی عبادت ہیں' عمرہ فردی عبادت ہے مگر حج قومی عبادت ہے۔ اسی طرح چندہ عام یا صدقہ و خیرات فردی عبادت ہے مگر زکوٰۃ قومی عبادت ہے کیونکہ اس کے متعلق حکم ہے کہ بیت المال میں جمع ہو اور قوم کی ترقی کے لئے خرچ ہو۔ تو ان ساری عبادتوں میں ایک حصہ قوم کا ہے اور ایک افراد کا۔ حج فرض ہے۔ مگر عمرہ نفل اسی لئے حج قومی عبادت ہے اور عمرہ فردی۔ نوافل فرض نہیں وہ فردی عبادت ہیں مگر نماز با جماعت فرض ہے اور وہ قومی عبادت ہے۔ نفلی صدقہ فردی عبادت ہے مگر زکوٰۃ فرض ہے اور وہ قومی عبادت ہے۔ اسی طرح رمضان کے علاوہ دوسرے دنوں کے روزے فردی عبادت ہیں اور وہ

فرض نہیں مگر یہ روزے فرض ہیں اور قومی عبادت ہیں۔ پس یہ مت خیال کرو کہ روزے فردی عبادت ہیں یہ قومی عبادت ہے اور جو لوگ قوم کے لئے قربانیاں کرتے ہیں وہی قومی عید دیکھنے کے مستحق ہوتے ہیں بلکہ وہ دہرا فائدہ اٹھاتے ہیں یعنی انہیں وہ فائدہ بھی پہنچتا ہے جو فردی ہوتا ہے۔ اور وہ فائدہ بھی پہنچتا ہے جو قومی ہوتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو حج کرنے والا وہ فائدہ بھی اٹھالیتا ہے جو عمرے والا اٹھاتا ہے مگر عمرے والا وہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا جو حج کرنے والا اٹھاتا ہے۔ اسی طرح نفلی روزے رکھنے والا وہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا جو رمضان کے روزے رکھنے والا اٹھاتا ہے مگر رمضان کے روزے رکھنے والا نفلی روزوں کا فائدہ بھی اٹھالیتا ہے۔ یعنی جس طرح نفلی روزہ رکھنے والا جاگتا ہے اسی طرح وہ بھی جاگتا ہے' جس طرح وہ عبادت کرتا ہے اسی طرح یہ بھی کرتا ہے' جس طرح وہ روزہ رکھتا ہے اسی طرح یہ بھی رکھتا ہے مگر اسے مزید فائدہ یہ حاصل ہو جاتا ہے کہ یہ نیکی میں اپنی قوم کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔ اسی طرح نفلی صدقہ بھی نیکی پیدا کرتا ہے اور فرض زکوٰۃ بھی نیکی پیدا کرتی ہے مگر فرق یہ ہے کہ نفلی صدقہ صرف ایک انسان کی ذات کو فائدہ پہنچاتا ہے مگر فرض زکوٰۃ قوم کو فائدہ پہنچاتی ہے اور زکوٰۃ دینے والا جانتا ہے کہ میرا روپیہ یونہی خرچ نہیں ہوگا بلکہ قومی بیت المال میں جاکر ساری قوم کے لئے ایک اصول اور سکیم کے ماتحت خرچ ہوگا۔ اسی طرح نفلی نماز پڑھنے والا بھی نیکی حاصل کرتا ہے اور باجماعت نماز پڑھنے والا بھی نیکی حاصل کرتا ہے مگر نفلی نماز میں وہ فائدہ انسان کو حاصل نہیں ہو سکتا جو نماز باجماعت کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے کیونکہ نماز باجماعت میں یہ سبق سکھایا جاتا ہے کہ تمہیں ہمیشہ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ [۱۶] رہنا چاہئے اور ایک امام کی اطاعت پر ہر وقت کمربستہ رہنا چاہئے۔ تو فرض اور قومی عبادتوں سے دوہرا فائدہ انسان کو پہنچتا ہے۔ مگر نفلی اور فردی قربانیاں صرف ایک فائدہ انسان کو پہنچاتی ہیں۔ غرض روزوں نے ہمیں عظیم الشان سبق دیا ہے مگر افسوس ہے کہ بوجہ عرصہ دراز سے محکوم ہونے کے مسلمان اس سے وہ فائدہ نہیں اٹھا رہے جو پہلے زمانوں میں مسلمان اٹھاتے تھے۔ اور ابھی تک ان میں قومی ترقی اور قومی بہبود کا خیال پیدا نہیں ہوا اور میں دیکھتا ہوں کہ احمدیوں میں بھی کسی حد تک یہ بات پائی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ تڑپ ہر احمدی کے دل میں پائی جائے گی کہ میں نیک ہو جاؤں مگر یہ تڑپ بہت کم احمدیوں کے دلوں میں پائی جائے گی کہ ہماری قوم نیک ہو جائے۔ یہ تڑپ ہر احمدی کے دل میں پائی جائے گی کہ میں بدنام نہ ہوں مگر یہ تڑپ بہت کم احمدیوں کے دلوں میں پائی جائے گی کہ قوم بدنام نہ

ہو۔ یہ تڑپ ہر احمدی کے دل میں پائی جائے گی کہ مجھے ترقی اور کامیابی حاصل ہو مگر یہ تڑپ بہت کم احمدیوں کے دلوں میں پائی جائے گی کہ میری قوم کو ترقی اور کامیابی حاصل ہو سوائے علماء و عارفین کے مگر ان علماء و عارفین سے میری مراد جسمانی عالم نہیں بلکہ روحانی عالم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی قومی قربانی کا مطالبہ کیا جاتا ہے افراد بہانے بنانے لگ جاتے ہیں وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے قومی عبادات کے متعلق فردی تکلیفوں کی ذرہ بھی پروا نہیں کی۔ چنانچہ دیکھ لو فردی نوافل جب جی چاہے انسان پڑھ سکتا ہے چاہے دن میں پڑھے یا رات کو پڑھے مگر جو نمازوں کے اوقات ہیں ان میں ہر ایک کو قربانی کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً ظہر کے وقت ہر ایک کو بلایا جاتا ہے۔ جنہیں اس وقت زیادہ سے زیادہ کام ہوتا ہے انہیں بھی اور جنہیں تھوڑا کام ہوتا ہے انہیں بھی۔ اس وقت کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کام زیادہ ہے اس وقت اللہ تعالیٰ کہتا ہے آؤ اور نماز باجماعت پڑھو اور اپنے کام کا نقصان کرو۔ تو قومی عبادتوں میں ہمیشہ افراد کو قربانیاں کرنی پڑتی ہیں اور ان کی تکلیفوں کی کوئی پروا نہیں کی جاتی۔ ہمارے ملک کا ایک تاریخی واقعہ ہے کہ شاہ جہان کی بیوی ممتاز محل نے خواب میں دیکھا کہ وہ مرگئی ہے اور فرشتے اس کی قبر پر ایک شاندار عمارت تعمیر کر رہے ہیں۔ اس نے بیدار ہونے پر بادشاہ سے ذکر کیا اور بادشاہ نے وعدہ کیا کہ وہ اس کی قبر پر ویسی ہی شاندار عمارت بنائے گا۔ جب وہ مرگئی تو جس قسم کی عمارت کا اس نے بادشاہ سے ذکر کیا تھا اس قسم کی عمارت تیار کرنے کے لئے بادشاہ نے انجنیئروں کو بلایا۔ مگر ہر انجنیئر نے یہی کہا کہ اس قسم کی عمارت بننی ناممکن ہے۔ آخر ایک انجنیئر ایران سے آیا اور اس نے کہا میں اس قسم کی عمارت بنانے کے لئے تیار ہوں مگر شرط یہ ہے کہ آپ دو لاکھ روپیہ کی تھیلیاں لے کر کشتی میں میرے ساتھ بیٹھ جائیں اور جمنا کے دوسرے کنارے پر چلیں اور مجھے وہ مقام دکھائیں جہاں آپ مقبرہ بنانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ بادشاہ نے ہزار ہزار روپیہ کی دو سو تھیلیاں بھروا کر ساتھ رکھ لیں اور کشتی میں وہ اور انجنیئر سوار ہو گئے۔ ابھی تھوڑی دور ہی کشتی گئی تھی کہ انجنیئر نے ایک تھیلی اٹھائی اور پانی میں یہ کہتے ہوئے ڈبو دی کہ بادشاہ سلامت! یوں روپیہ خرچ ہو گا۔ بادشاہ نے کہا کوئی پروا نہیں مقبرہ بننا چاہئے۔ پھر دو گز کشتی آگے چلی تو اس نے دوسری تھیلی اٹھا کر دریا میں پھینک دی اور کہا بادشاہ سلامت! یوں روپیہ غرق ہو گا۔ بادشاہ نے کہا کوئی پروا نہیں مقبرہ بننا چاہئے۔ یہاں تک کہ اسی طرح اس نے دو سو تھیلیاں دریا میں غرق کر دیں مگر بادشاہ کے ماتھے پر ذرا بھی بل نہ آیا۔ جب کشتی

دوسرے کنارہ پر پہنچی تو بغیر وہ جگہ دیکھنے کے جہاں بادشاہ مقبرہ بنوانا چاہتا تھا وہ انجنیئر کہنے لگا بادشاہ سلامت! اب مقبرہ بن جائے گا۔ وہ کہنے لگا تم نے جگہ تو دیکھی نہیں۔ اس نے کہا میں صرف آپ کے حوصلہ کا امتحان لینا چاہتا تھا اور میں نے دیکھ لیا کہ دو لاکھ روپیہ کے غرق ہو جانے کے باوجود آپ کے ماتھے پر بل تک نہیں آیا۔ پس میں سمجھ گیا ہوں کہ جو شخص دو لاکھ روپیہ اس طرح غرق کرا سکتا ہے وہ مقبرہ پر کئی کروڑ روپیہ بھی خرچ کر سکتا ہے۔ یہ بھی اسی بات کی مثال ہے کہ دنیا میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو قربانیاں کرتے ہیں۔ بادشاہ نے یہ دیکھ کر کہا باقی انجنیئر بڑے نالائق تھے جو کہتے تھے کہ ایسا مقبرہ نہیں بن سکتا۔ وہ کہنے لگا حضور وہ نالائق نہیں تھے انہوں نے حضور کے حوصلے کا امتحان لئے بغیر ہی خیال کر لیا تھا کہ پچاس ساٹھ کروڑ روپیہ آپ کہاں مقبرہ پر خرچ کریں گے مگر میں نے آپ کا امتحان لے کر یقین کر لیا ہے کہ آپ اس قدر روپیہ خرچ کر دیں گے اگر وہ بھی امتحان لیتے تو ان میں بھی بڑے بڑے لائق انجنیئر تھے اور وہ اس قسم کا مقبرہ بنا سکتے تھے۔ غرض تو اس واقعہ میں بھی یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ جس قوم کے افراد قومی ترقی کے لئے قربانیاں کرتے ہیں وہ قوم دنیا پر غالب آکر رہتی ہے لیکن جس قوم کے افراد اس نکتہ کو فراموش کر دیتے ہیں وہ ہار جاتی ہے۔ تم میں سے ہر شخص جو یہ خیال کرتا ہے کہ میں اس وقت قربانیوں میں حصہ لوں گا جب مجھے یقین ہو کہ عید میں اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا اس سے زیادہ احمق اور اس سے زیادہ بے وقوف اور کوئی نہیں اور اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اس کی قوم کبھی جیت نہیں سکتی۔ قوم اسی وقت جیت سکتی ہے جب ہر فرد یہ سمجھ لے کہ مجھے عید چاہے میسر آئے یا نہ آئے چاہے میں روزوں میں ہی مر جاؤں یا زندہ رہوں مجھے اس کی پروا نہیں اگر میری قوم کو عید مل گئی تو میں سمجھ لوں گا کہ مجھے بھی عید مل گئی۔ اس صورت میں یقیناً تمہاری ترقی میں کوئی شُبہ نہیں اور پھر کسی اور کے ہاتھ سے کیا، خدا تمہارے ہاتھوں پر ہی اسلام کو فتح دے گا کیونکہ تم اس فتح کے اول مستحق ہو اور تم نے ایک نبی کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا ہے۔ آخر خدا نے اپنا کام کرنا ہے اور اس نے اسلام کو دنیا پر غالب کرنا ہے۔ یہ وہ فیصلہ ہے جو ہو چکا اور جس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا لیکن اگر تم اس نقطہ نگاہ کو سمجھ لو گے جو میں نے بتایا ہے تو پھر ہمیں فتح حاصل ہو گی اور اگر اس نقطہ نگاہ کو نہیں سمجھو گے تو یا تو فتح سے محروم ہو جاؤ گے اور یا پھر مرتد ہو کر مرو گے اور قوم کی فتح کی خوشی تمہیں نصیب نہیں ہو گی۔ لیکن اگر تم اس نقطہ نگاہ کو سمجھ لو گے اور تم میں سے ہر شخص

یہ فیصلہ کر لے گا کہ میری فردی زندگی کی کوئی حقیقت نہیں میرا چین ' میرا آرام اور میری زندگی سب قومی حیات میں ہے تو تم کامیابیوں پر کامیابیاں حاصل کرتے چلے جاؤ گے۔ لیکن قوم سے میری مراد جماعت احمدیہ ہی ہے نہ کہ کچھ اور۔ اور ان معنوں میں قوم کا لفظ حضرت خلیفۃ المسیح الاول بھی استعمال فرمایا کرتے تھے لیکن جب آپ کی مراد قوم سے جماعت احمدیہ نہ ہوتی تو آپ اس لفظ پر چڑتے اور فرماتے قوم قوم کہنے نے ہی لوگوں کو تباہ کر دیا ہے۔ تو قوم سے میری مراد جماعتِ احمدیہ ہے پس جو شخص قومی ترقی اپنے مدنظر رکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میرے وجود کی کوئی حیثیت نہیں وہ صرف قوم کے جسد کے مقابلہ میں ایک عضو ہے اور عضو چاہے سو دفعہ کٹ جائے اس کی کوئی پروا نہیں کی جاسکتی اور جو شخص سمجھتا ہے کہ میری عید جماعت کی عید میں ہے اگر جماعت کو عید میسر آگئی تو مجھے بھی آگئی وہ ضرور کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور جب میں نے کہا ہے کہ وہ ضرور کامیاب ہو جاتا ہے تو اس سے میرا یہ مطلب ہے کہ اگر کوئی شخص اس نکتہ کو اپنے مدنظر نہیں رکھتا تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ اس موقع پر مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا۔ کہتے ہیں کوئی بادشاہ تھا۔ جس کا یہ طریق تھا کہ وہ جس پر خوش ہوتا اسے تین ہزار درہم انعام دے دیتا۔ ایک دفعہ وہ کہیں سے گذر رہا تھا کہ اس نے دیکھا ایک بڈھا جس کی عمر نوے سال کے قریب ہے وہ زمین میں ایک ایسا درخت بو رہا ہے جس نے بہت مدت کے بعد پھل لانا تھا۔ بادشاہ یہ دیکھ کر وہاں کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا میاں بڈھے! یہ کیا حماقت کی بات کر رہے ہو جب تک یہ درخت بڑا ہو گا اور اسے پھل لگے گا اس وقت تک تو تم فوت ہو چکے ہو گے پھر کیوں یہ درخت بو رہے ہو۔ وہ بڈھا یہ سنتے ہی کدال چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا بادشاہ سلامت! آپ جیسا دانا آدمی ایسی بیوقوفی کی بات کہے تو تعجب ہی آتا ہے۔ اے بادشاہ! اگر ہمارے باپ دادے اسی خیال کے ہوتے تو ہم درختوں کے پھل کہاں سے کھاتے انہوں نے درخت لگائے اور ہم نے ان کے پھل کھائے اب ہم درخت لگائیں گے اور ہماری نسلیں اس کا پھل کھائیں گی۔ جب یہ معرفت کا نکتہ اس بڈھے کی زبان سے نکلا تو بے اختیار بادشاہ کہنے لگا۔ زہ۔ جس کے یہ معنے تھے کہ تم نے کیا ہی اچھی بات کہی۔ وزیر نے فوراً تین ہزار روپیہ کی تھیلی نکالی اور اس بڈھے کے سامنے پیش کر دی۔ اس بڈھے نے وہ تھیلی لی اور پھر بادشاہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا بادشاہ سلامت! آپ کی بات کی تو ابھی تردید ہو گئی آپ کہتے تھے کہ تو نے اس درخت کا پھل کب کھانا ہے جب تک اسے پھل لگے گا اس وقت تک تو مرچکا

ہو گا مگر بادشاہ سلامت دیکھئے لوگ تو دس بارہ برس کے بعد درخت کا پھل کھاتے ہیں اور میں نے اس درخت کا پھل اسی وقت کھالیا۔ بادشاہ یہ سنتے ہی پھر بے اختیار کہہ اٹھا۔ زہ۔ اور وزیر نے جھٹ تین ہزار درہم کی دوسری تھیلی بھی بڈھے کے سامنے پیش کر دی۔ یہ دیکھ کر وہ بڈھا کہنے لگا بادشاہ سلامت! اب دیکھئے ایک اور لطیفہ ہو گیا۔ لوگ تو اپنے درختوں کا پھل سال میں ایک دفعہ کھاتے ہیں اور میرے درخت نے تھوڑی ہی دیر میں دو دفعہ پھل دے دیا۔ بادشاہ بے اختیار کہہ اٹھا۔ زہ۔ اور وزیر نے جَھٹ تیسری تھیلی بھی اس کے سامنے پیش کر دی۔ یہ دیکھ کر بادشاہ کہنے لگا یہاں سے چلو ورنہ یہ بڈھا ہمیں لوٹ لے گا۔ [۱۸]

یہ بظاہر ایک لطیفہ ہے مگر اتنی معرفت کا نکتہ اپنے اندر رکھتا ہے کہ قومیں اس نکتہ کو یاد رکھ کر زندہ رہ سکتی ہیں اور قومیں اس نکتہ کو فراموش کر کے ہلاک ہو سکتی ہیں۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ دیکھنے والے کو صرف یہی نہیں دیکھنا چاہئے کہ میری قربانی مجھے کیا فائدہ دے گی بلکہ اسے یہ دیکھنا چاہئے کہ میری قربانی کا میری اولاد اور آئندہ نسل پر کیا اثر پڑے گا۔ دنیا میں بے اولاد بہت کم ہوتے ہیں اور جو بے اولاد ہوں ان کے بھی بھائیوں اور بہنوں کی اولاد ہوتی ہے۔ الاماشاء اللہ۔ تو انسان جو قربانیاں کرتا ہے ان کے متعلق اسے سمجھ لینا چاہئے کہ اگر اس کا مجھے فائدہ نہ پہنچا تو قوم کو فائدہ پہنچ سکتا ہے اور اگر کسی کو قوم کا خیال نہ آئے تو وہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ میری اولاد کو اس سے فائدہ پہنچے گا۔ بہرحال قومی طور پر اور اہلی اور عائلی طور پر بھی قربانیوں کا نفع پہنچ جاتا ہے اور کون ہے جو اس غرض کے لئے قربانی کرنے کیلئے تیار نہ ہو کہ میری اولاد کو میری قربانی سے فائدہ پہنچے۔ ہم تو دیکھتے ہیں لوگ آپ مرجاتے ہیں مگر اپنی اولاد کو زندہ دیکھنے کے متمنی ہوتے ہیں۔ ہمایوں بیمار ہوا تو بابر نے اس کی چارپائی کے گرد بارہ چکر کاٹے اور دعا کی کہ الٰہی اس کی موت مجھے دے دے۔ اس کی یہ دعا ایسی قبول ہوئی کہ آٹھ دس دن کے اندر اندر ہمایوں اچھا ہو گیا اور بابر بیمار ہو کر مرگیا۔ [۱۹] تو ماں باپ بچوں کی خاطر قربانیاں کرتے ہیں پھر کون کہہ سکتا ہے کہ اگر قومی ترقی کے لئے قربانیاں کرنی پڑیں تو وہ دوبھر ہو سکتی ہیں۔ قومی ترقی کے بعد تو تمام قوم معزز سمجھی جانے لگتی ہے چنانچہ ایک عرب شاعر کہتا ہے میں ذلیل نہیں بلکہ معزز ہوں اس لئے کہ میرے ہمسائے معزز ہیں مگر

وَجَارُ الْاَکْثَرِیْنَ ذَلِیْلٗ [۲۰]

اکثر لوگوں کے ہمسائے ذلیل ہوتے ہیں اور اس لئے وہ خود بھی ذلیل سمجھے جاتے ہیں۔ اسی

طرح جو قوم غالب ہوتی ہے اس کے ذلیل ترین وجود بھی غالب ہوتے ہیں اور جو قوم ذلیل ہوتی ہے اس کے معزز ترین افراد بھی ذلیل ہو جاتے ہیں۔ پس فردی طور پر اگر عزت نہ ملے لیکن مجموعی طور پر مل جائے تو مجموعی عزت بھی بڑی بیش قیمت ہوتی ہے اور اس کے نتیجہ میں اس قوم کے افراد بھی معزز سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن جو افراد اپنی عزت کے لئے قوم کی عزت برباد کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں ان کی اپنی عزت بھی کوئی نہیں ہوتی۔ کچھ عرصہ ہوا جب امریکہ نے امتناع شراب کا حکم نافذ کیا[۱۲] تو اس وقت امریکہ کے علاقہ میں باہر کی قومیں شراب لا کر فروخت کر دیا کرتی تھیں۔ ایک دفعہ ایک انگریزی جہاز وہاں آیا اور امریکن جہازوں کو یہ شبہ ہوا کہ اس میں شراب ہے انہوں نے انگریزی جہاز کو روکا مگر وہ نہ رکا۔ اتفاقاً وہ جہاز ایسی جگہ تھا جہاں امریکن جہاز اسے روکنے کا اختیار نہیں رکھتے تھے۔ سمندروں میں جہازوں کی حد بندی کی ہوئی ہوتی ہے اور ساحل کے قریب تین میل کے اندر اندر غیر ملکی جہازوں کی تلاشی لی جا سکتی ہے مگر وہ جہاز اس حد سے باہر تھا اور وہ اس علاقہ میں تھا جہاں انگریزی مملکت تسلیم کی جاتی تھی۔ جب انگریزی جہاز نہ رکا تو امریکہ کے جہاز نے اس کا تعاقب کیا اور آخر ہوا میں ایک گولہ پھینکا۔ طریق یہ ہے کہ جہاز والے پہلے ہوا میں گولہ پھینکتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب تو ہم نے ہوا میں گولہ پھینکا ہے مگر دوسرا گولہ تم پر پھینکا جائے گا۔ اگر باز آتے ہو تو آ جاؤ۔ جب امریکن جہاز نے ہوا میں گولہ پھینکا تو یہ دیکھتے ہی انگریزی جہاز ٹھہر گیا اور اس نے اپنے جہاز پر انگریزی جھنڈا لہرا دیا جس کے معنی یہ تھے کہ یہ انگریزی حکومت کا جہاز ہے اگر ہمت ہے تو اس پر گولہ پھینک کر دیکھو۔ امریکن جہاز نے جب انگریزی جھنڈا دیکھا تو چُپ کر کے واپس لوٹ گیا۔ تو قوموں کی عزت کے ساتھ ہی افراد کی عزت وابستہ ہوتی ہے لیکن افراد کی عزت کے ساتھ قوم کی عزت وابستہ نہیں ہوتی۔ مسلمانوں نے جب سے اس نکتہ کو بھلا دیا وہ ذلیل ہو گئے، وہ کمزور ہو گئے اور ان میں کوئی قوتِ عمل باقی نہ رہی۔ آج اللہ تعالیٰ نے احمدیت کے ذریعہ پھر اسلام کی ترقی کا فیصلہ کیا ہے۔ پس آج اگر ہماری جماعت کے افراد اس نکتہ کو سمجھ لیں گے تو وہ عزت پا لیں گے لیکن اگر وہ اس نکتہ کو نہیں سمجھیں گے تو وہ اسی طرح بے طاقت ہو کر رہ جائیں گے جس طرح مسلمان ہوئے۔ اگر ہم میں سے ہر فرد کے ذہن میں یہ بات موجود رہے گی کہ احمدیت کی عزت میں میری عزت ہے اور احمدیت کی ذلت میں میری ذلت ہے۔ اگر میں مر جاؤں اور احمدیت زندہ رہے تو میں کامیاب ہو گیا اور اگر میں زندہ رہوں

اور احمدیت کو شکست ہو جائے تو ایسی زندگی موت سے بد تر ہے تو اسی دن سے ہماری جماعت کے لئے قومی احیاء کا دن شروع ہو جائے گا ورنہ ہم اپنے لئے اور اپنے خاندانوں کے لئے موت طلب کر رہے ہیں۔ آج احمدیت میں شامل ہونے کے بغیر کوئی عزت نہیں۔ اگر احمدیت دنیا میں ذلیل ہوگی تو ہماری جماعت کا ہر فرد ذلیل ہوگا اور اگر احمدیت معزز ہوگی تو ہماری جماعت کا ہر فرد معزز ہوگا۔

میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمارے دلوں میں وہ محبت پیدا کرے جو انبیاء کی جماعتوں کے قلوب میں پیدا ہوا کرتی ہے اور ہمارے تمام کام اس کی رضا اور خوشنودی کے حصول کے لئے ہوں۔ ہم اپنے نفسوں کو بالکل بھول جائیں' اپنے خاندانوں کو بالکل بھول جائیں' اپنی نسلوں کو بالکل بھول جائیں اور صرف ایک ہی خواہش اور ایک ہی مقصد ہمارے مد نظر ہو اور وہ یہ ہے کہ اسلام اور احمدیت کا بول بالا ہو' احمدیت کی ترقی ہو اور احمدیت ہی دنیا میں قائم ہو۔

(الفضل ۳۰۔اپریل ۱۹۵۷ء)

۱؎ روسی سوشلسٹ پارٹی کے بائیں بازو جو لینن کی زیرِ قیادت ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد حکومت پر قابض ہوا کی طرف سے پیش کردہ فلسفہ۔ یہ پارٹی بعد میں کمیونسٹ پارٹی کے نام سے موسوم ہوئی۔

۲؎ ۱۸۷۰ء۔ ۱۹۲۴ء

۳؎ رامچندر جی کی لنکا کے راجہ راون سے لڑائی جو بالآخر راون کی شکست اور موت پر ختم ہوئی کی یادگار کے طور پر ہندو اب تک ہر سال یہ تقریب بڑے اہتمام سے مناتے ہیں۔

۴؎ ترمذی کتاب الذھد باب من تکلم بالکلمة لیضحک الناس

۵؎ صحیح بخاری کتاب المرضی باب عیادة الصبیان

۶؎ ۱۸۶۵ء۔۱۹۳۶ء

۷؎ ۱۸۵۹ء۔ ۱۹۳۰ء

۸؎ ۱۸۶۷ء۔ ۱۹۴۷ء

۹؎ مجنونانہ

۱۰؎ حضرت صاحبزادہ صاحب کے صاحبزادہ سید محمد طیب صاحب کے بقول حضرت صاحبزادہ

صاحب کے تمام بچے صاحبزادہ صاحب کی زندگی میں ہی پیدا ہوئے تھے اور اپنے سب بچوں اور بچیوں کے نام بھی صاحبزادہ صاحب نے خود رکھے تھے۔
صاحبزادہ صاحب کی شہادت کے وقت آپ کے صرف دو بچے بالغ تھے۔ ایک لڑکا محمد سعید صاحب جن کی عمر اس وقت ۱۸ سال تھی اور ایک لڑکی بی بی شفاء صاحبہ جن کی عمر اس وقت ۲۵ سال تھی۔ یہ دونوں بچے شادی شدہ تھے ان کے علاوہ صاحبزادہ صاحب کے چار لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں جن میں سے سب سے بڑی بچی کی عمر ۱۰ سال تھی۔
(مکتوب صاحبزادہ محمد طیب صاحب بنام مرتب۔ محررہ ۲۹۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء)

۱۱ النسآء:۱۰۵
۱۲ صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب الترغیب فی قیام رمضان وھو التراویح
۱۳ البقرۃ:۱۸۶
۱۴ صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب جواز النافلۃ قائما الخ
۱۵ صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب من احق بالامامۃ
۱۶ الصّفّ:۵
۱۷ شاہجہان ۱۰۰۰ھ۔ ۱۵۹۳ء / ۱۰۷۶ھ / ۱۶۶۶ء۔ ممتاز محل ۱۰۰۰ھ۔ ۱۵۹۲ء / ۱۰۴۰ھ۔ ۱۶۳۱ء
۱۸ "نظم نوشیرواں و باغبان پیر"۔ الٰہی نامہ مصنفہ فرید الدین عطار۔ بحوالہ کتاب فارسی مطبوعہ سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ۔ لاہور۔ ۱۹۵۶ء و سیاست نامہ مصنفہ نظام الملک طوسی۔
۱۹ بابر ۸۸۸ھ / ۱۴۸۳ء۔ ۹۳۷ھ / ۱۵۳۰ء۔ ہمایوں ۹۱۳ھ / ۱۵۰۸ء۔ ۹۶۳ھ / ۱۵۵۶ء "ہمایوں نامہ" مصنفہ گلبدن بیگم بنت بابر بادشاہ اردو ترجمہ صفحہ ۷۳۔ تاریخ ہندوستان مصنفہ خان بہادر شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ دہلوی جلد ۳ صفحہ ۱۱۸۔۱۱۹
۲۰ پورا شعر یوں ہے۔

وما ضرنا انا قلیل وجارنا
عزیز وجار الاکثرین ذلیل

(سموئیل بن علویا۔ دیون الحماسہ۔ باب الحماسہ صفحہ ۳۲)

۱۲۔ امریکہ میں ۱۶۔ جنوری ۱۹۱۹ء کو امتناع شراب کا حکم نافذ ہوا تھا۔

Historians' History of the world Vol. XXVI: These Eventful years: Part II p. 538